آرا وافکار

محمد طارق ایوبی

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے ملی افکار

قومی ضمیر پر موت طاری

۱۹۶۷ء کے افسوس ناک المیہ سے مولاناؒ پر جو اثر ہوا، اس نے ان کی زبان حق ترجمان سے بہت کچھ کہلوایا، اس وقت مولاناؒ کی زبان سے جو جملے ادا ہوئے، آج ان کی معنویت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، اس وقت عالم عربی ہی نہیں خود ہندوستان کی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ گویا قومی ضمیر خواب خرگوش میں مبتلا ہے یا پھر حس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے، اس پر طرہ وطرفہ یہ ہے کہ اگر کسی نے حالات کی سنگینی پر زبان کھول دی اور حقائق بیان کر دیے تو لوگ اس کے درپہ ملامت واستہزاء ہو گئے، قومی مسائل اور اہم مسائل کی تنقید کو شخصی مسئلہ بنا دیا، اس طرح کا دفاعی انداز اور مصلحت پسندی یا خاموشی کس طرح زیب ہے کہ مصر میں اسلامی تحریک (خواہ کسی کا اس سے نظریاتی اختلاف ہی کیوں نہ ہو) کو اکھاڑ پھینکا گیا، اور سعودی عرب نے اس پر خوشی کے شادیانے بجائے، غیرت اسلامی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا گیا اور ہمارے قلم وزبان نے احتساب کے لئے حرکت بھی نہ کی، احتساب تو دور صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

> ''میں ان جیسے المیوں سے کوئی خطرہ نہیں محسوس کرتا بلکہ مجھے اصل خطرہ اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے، ضمیر کا کام ہے احتساب اور غلطیوں کی گرفت، خواہ وہ اپنے باپ اور بھائی سے سرزد ہوئی ہو یا کسی ذی وقار پیشوا اور رہنما سے، اگر یہ ضمیر مردہ ہو جائے اپنا فطری عمل چھوڑ دے، اپنی افادیت کھو بیٹھے، اور اس میں حقائق کے اعتراف کی صلاحیت باقی نہ رہ جائے، تو یہ سب سے بڑا خطرہ ہے، یہ انسانیت کی موت ہے، ایک انسان مرتا ہے تو ہزاروں انسان پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن جب ضمیر مردہ ہو جائے، اجتماعی اور قومی ضمیر سے زندگی کے آثار ناپید ہو جائیں، جب قوم سے محاسبہ کی صلاحیت اور جرأت ختم ہو جائے، جب تنقید واحتساب کی جگہ شاباشی، اور داد وتحسین کے پھول برسنے لگیں تو یہ ایسا المیہ ہوگا جس کے بعد کسی المیہ کا تصور ہی ممکن نہیں۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۱۸۔۱۱۹)

یہی نہیں، آگے اور وضاحت سے فرماتے ہیں:

''سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے کہ یہ ضمیر اپنا کام کرنا بند کردے، اور یہ صرف عرب کے لئے یا صرف مسلمانوں کے لئے خطرہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے خطرہ ہے کیونکہ اللہ نے اسی مسلم ضمیر ہی کو اپنے رازوں کا امین بنایا ہے اس نے ہر مسلمان کو دنیا کا متولی اور ہمیشہ کے لئے عدل و انصاف کا میزان بنایا ہے، جو کامل احتیاط اور ایمانداری کے ساتھ اور پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ فیصلہ کرے کسی فرد کی رعایت نہ کرے اور نہ کسی کو کسی پر ترجیح دے، لیکن جب یہ میزان ہی اپنا کام چھوڑ دے تو پھر عدل وانصاف کی توقع کس سے کی جائے، جب نمک اپنی نمکینی ضائع کردے تو آپ ہی بتلائیں کھانا کس چیز سے نمکین کیا جائے؟ یہاں یہ مصیبت نہیں کہ کھانا نمکین نہیں ہے بلکہ مصیبت یہ ہے کہ نمک کی نمکینی جاتی رہی، مصیبت یہ ہے کہ عدل وانصاف کی میزان سے کارکردگی کی صلاحیت ختم ہوگئی، وہ غیر جانبدار نہیں رہی کسی کی دوست ہوگئی تو کسی کی دشمن۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۱۔۱۲۲)

قیادت کا محاسبہ کیجیے

حقیقت یہ ہے کہ جب قومی وملی مسائل میں سیاستدانوں اور حکمرانوں کا احتساب کرنا قوم بند کردیتی ہے تو وہ مطلق العنان ہو جاتے ہیں، شاہی نظام تو نام ہی ہے مطلق العنانیت کا، اگر چہ اس پر اسلامیت اور مصنوعی و برائے نام شوری کی خوبصورت چادر ڈالی جائے لیکن دور رہ کر، آزاد ملک میں رہ کر، ایک ملت کے فرد کی حیثیت سے جب کچھ لوگوں نے موجودہ کشمکش میں بعض عرب ممالک کا احتساب کرنا چاہا تو بہت سے لوگ چیں بہ جبیں ہو گئے، جب کہ ان کا جرم ایسا تھا کہ ان سے مجرموں کا سا معاملہ کیا جاتا، انھوں نے اسلام کی تاریخ کو داغدار کرنے کا کام کیا تھا، ملت اسلامیہ کا سر شرم سے جھکا دیا تھا، لیکن اب بھی ان کی عقیدت ان کا احترام سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

اگر قیادتوں کا احتساب نہ کیا گیا تو حالات کا یہ رخ خراب تر ہوتا جائے گا، حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی ہمت پیدا کرنی پڑے گی، کیونکہ ہمارے عقیدے کے مطابق ملت کا ادنیٰ سا مسئلہ بھی کسی فرد کا نہیں ملت کا ہوتا ہے اور اہم ہوتا ہے چہ جائے کہ قائدین کو باعزت بری ان معاملات میں کیا جائے جو ملت کی تاریخ میں ایک اور داغ کا اضافہ کریں اور اہل حق کے مقابلہ یہود و نصاریٰ کے مفاد میں کام کریں:۔

''ہم رومیوں کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ وہ بہت سے دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے، بحر و بر اور جنگ وامن ہر ایک کے لئے ان کا ایک الگ دیوتا تھا، لیکن ان دیوتاؤں کی پرستش کے باوجود کبھی کبھی ان پر بھی جھنجھلا جاتے تھے، اگر ان کو کسی مہم میں کامیابی نہ ہوتی یا ان کی امیدیں بر نہ آتیں تو دیوتاؤں پر بھی ان کا غصہ بھڑک اٹھتا تھا، تاریخ کا واقعہ ہے کہ رومی شہنشاہ آگسٹس (AUGUSTUS) کا بحری بیڑہ سمندر میں غرق ہوگیا تو وہ غصہ سے اتنا مشتعل ہوا کہ سمندر کے دیوتا نیپچون (NEPTUNE) کی مورتی چور چور کردی، یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، ناکامی اور جھنجھلاہٹ انسان کی فطرت ہے، اور ہم تو مومن و مؤحد ہیں، اور ایک اللہ کی

ذات پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارے لئے تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں کہ کسی قیادت پر اللہ ورسول پر ایمان کی طرح کامل ایمان لے آئیں، ہمارا فرض ہے کہ اپنے قائدین کا محاسبہ کریں اور خود اپنے آپ کا محاسبہ کریں اور اپنے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی حالات کا غائر نظر سے جائزہ لیں اور انھیں میں مصائب کے اسباب تلاش کریں، کسی فرد یا جماعت کی اندھی اطاعت وگمراہی کے ایسے غار میں پہونچادے گی جہاں ہدایت کی روشنی نہیں پہنچ سکے گی، اور نہ اس سے نجات آسان ہوگی اور قیادت کا محاسبہ نہ کرنا اور اس کی غلطیوں کا مؤاخذہ نہ کرنا اور اس سے وضاحت نہ طلب کرنا، یہ ایسی اطاعت ہے، جس کے بارہ میں قرآن کا فیصلہ ہے:

''فاتبعوا امر فرعون وما امر فرعون برشید، یقدم قومه یوم القیامة فاوردهم النار وبئس الورد المورود، واتبعوا فی هذه لعنة ویوم القیا مة، بئس الرفد المرفود'' (سورہ ہود ۹۷-۹۹) پھر وہ فرعون کے کہنے میں چلے اور فرعون کی بات درست نہیں تھی، وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا، پس ان کو آگ پر پہونچادے گا اور یہ پہونچنے کی بری جگہ ہے، اور پیچھے سے اس دنیا میں اس کو لعنت ملی، اور قیامت کے دن، یہ برا انعام ہے جو ملا'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۳۔۱۲۴)

آگے مزید صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

''اگر ہمارے اور آپ کے درمیان اسلامی عقیدہ کا اشتراک نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ ہمارا اور آپ کا انجام ایک ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا جواب ہم سے طلب کیا جاتا ہے تو شاید مجھے محاسبہ کا حق نہ ہوتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ قومیں اسی محاسبہ ہی کے سہارے زندہ رہتی ہیں، یوروپی اقوام میں اگر اتنی بیداری اور مخلصانہ تنقید کا چلن نہ ہوتا تو وہ تاریخ ماضی کی کہانی بن چکی ہوتیں، کڑی تنقید ان کی زندگی کا ایک اہم سبب ہے، وہ اپنے کسی رہنما کو یہ موقع نہیں دیتیں کہ ہمیشہ اقتدار پر قابض رہے، اور اس کی تعظیم وتکریم ہوتی رہے، یہ صرف یوروپی اقوام ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ مسلمانوں کے سربراہ اور قائدین کی بھی یہی حالت تھی۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۶۔۱۲۷)

احتساب اور محاسبہ: ہمارا امتیاز

اس میں کیا شک کہ احتساب سے ہی قومیں زندہ رہا کرتی ہیں، ان کا ضمیر بیدار رہتا ہے اور اپنا کام کرتا رہتا ہے، اور اگر محاسبہ نہ ہو تو پھر من مانیوں کا راج ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ بے ضمیری عام ہوتی ہے، آج حکومتوں کے سربراہوں کو کچھ کہنے اور ان سے کچھ پوچھنے کی بات درکنار! ادنی سے اداروں اور جماعت کے سربراہان کا حال یہ ہے کہ ان کے محاسبہ پر یا کسی خطا کی نشاندہی پر نہ صرف وہ بلکہ بے شمار لوگ چراغ پا ہو جایا کرتے ہیں، حتی کہ کسی معاملہ میں واضح طور پر استفسار کی گستاخی تصور کی جاتی ہے، کیا ضروری ہے کہ جو بھی صاحب منصب ہو، وہ صائب ہی ہو اور اس کا فیصلہ درست

ہی ہو، ذخیرۂ احادیث وسیر صحابہؓ میں واضح اشارات وواقعات موجود ہیں کہ ایک عام صحابی خلیفۂ وقت سے استفسار کرلیا کرتے تھے، اور برسر منبر ٹوک دیا کرتے تھے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام کسی بھی واقعہ کے ظہور کے متصلا بعد وضاحت کی درخواست کرتے تھے، اور آپ سوال کی مناسبت سے جواب مرحمت فرمادیا کرتے تھے۔

مصر کا المیہ اور اس میں بعض عرب ممالک بالخصوص سعودی عرب کے کردار پر جب بعض حلقوں نے آواز اٹھائی تو ان آوازوں کو دیوانے کی بڑ اور شدت پسندی سے تعبیر کیا گیا، تائید حق کی جگہ حق بات کہنے والوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی گئی اور مصلحت بے جا کو درست وصائب موقف سمجھا گیا، اس میں کیا شک کہ حرمین پر اہل تشیع کے غلبہ کا خطرہ ہے لیکن کیا اس خطرہ کا حل بھی امریکہ پیش کرے گا؟ اور کیا اس خطرہ کو آڑ بنا کر بڑے سے بڑے جرم کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ اسی مصلحت کے سبب موقع پرستوں نے مجرمین کی مداحی کی اور وقتی ورکیک فائدے اٹھا کر جرم وظلم کو مدح و توصیف کا رنگ دے دیا، حضرت مولاناؒ نے کیسا زبردست استشہاد کیا ہے اور کیسی طاقتور بات کہی ہے:۔

''جب ایک بڑھیا خلیفۂ ثانی کو ٹوک سکتی ہے تو ایک مسلمان یا مؤرخ کو یہ حق کیوں حاصل نہ ہو کہ وہ اپنے قائدین کا محاسبہ کرے.....عمر ابن الخطابؓ کے زمانہ میں ہر مسلمان کو یہ حق حاصل تھا کہ ان سے جواب طلب کرے، ایک دفعہ وہ مسجد نبویؐ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور کہا کہ سنو لوگو! اور اطاعت کرو، ایک صحابیؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم نہیں سنتے، خلیفہ نے کہا کیوں؟ لوگوں نے کہا آپ کے جسم پر مال غنیمت کی دو چادریں نظر آرہی ہیں، جبکہ ہم لوگوں کے حصہ میں ایک ہی ایک آئی ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کیا یہاں عبداللہ بن عمر موجود ہیں؟ وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ایک چادر میرے حصہ کی ہے، جو میں نے انھیں دے دی ہے، صحابی نے کہا ٹھیک ہے، اب ہم ہر حکم کی اطاعت کے لئے تیار ہیں۔

اسی ضمیر اور اسی جرأت وہمت کے ساتھ یہ امت زندہ رہی اور حادثات ومصائب کا سامنا کرتی رہی اور اپنی طویل تاریخ میں ترقی یافتہ اور بیدار شعور کا ثبوت دیتی رہی ہے اس نے ہمیشہ حق وانصاف کا ساتھ دیا ہے، اور غلطیوں اور کوتاہیوں کے ارتکاب پر گرفت کی ہے، اور انہی اوصاف کے ساتھ مستقبل میں بھی زندہ رہ سکتی ہے''۔ (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۸)

کمزوریوں پر آزادانہ تنقید

حضرت مولاناؒ نے ہمیشہ کمزوریوں پر بھرپور اور آزادانہ تنقید کی، اس سلسلہ میں وہ کبھی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، ہندوستان میں جب فکر ومطالعہ سے عاری بعض حضرات نے جمال عبدالناصر کی مخالفت پر مولانا پر تنقیدیں کیں تو باوجود اس کے کہ مولانا اپنی ذات پر کی گئی کسی تنقید کا جواب دینے کا مزاج نہیں رکھتے تھے، لیکن اس پر مولانا سے رہا نہ گیا، پھر انھوں نے ایک بھرپور مضمون لکھ کر ''ندائے ملت'' میں شائع کیا، اس کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

''۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو میں نے دمشق یونیورسٹی کے ہال میں ممبران پارلیمنٹ، اساتذۂ جامعہ، علماء اور

عمائدین شہر کے جلسہ میں جس کی صدارت یونیورسٹی کے عیسائی وائس چانسلر مشہور عرب فاضل قسطنطین زریق کر رہے تھے، فلسطین کے مسئلہ اور اس کے حل پر اپنا مقالہ پڑھا جو ''فلسطین کے المیے کے بنیادی اسباب'' کے نام سے دمشق، بیروت سے اور بغداد میں بار بار چھپا ہے، میں نے اس مقالہ میں موجودہ عربوں کی بنیادی کمزوریوں، ان کے رہنماؤں کی خامیوں، اور کوتاہیوں پر آزادانہ تنقید کرتے ہوئے مسئلۂ فلسطین کا حل پیش کیا تھا، عربوں نے اس مشورے کو جو ایک مسافر اور غیر ملکی کی زبان سے پیش ہوا تھا، اور جس میں تاریخ کی تلخی بھی تھی، نہ یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ''یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے،، باہر کے کسی آدمی کے مشورہ دینے کا کیا حق ہے؟'' اور نہ وہ اس صاف گوئی اور احتساب پر چیں بہ جبیں ہوئے، اسی طرح ۵۶ء میں مؤتمر اسلامی دمشق کے جلسہ میں ''مسئلہ فلسطین کا تعلق عالم اسلام کے دینی شعور کی بیداری سے'' کے عنوان سے میں نے پھر ایک مقالہ پڑھا اور اس کی اسی طرح پذیرائی ہوئی، اسی طرح دمشق، بیروت، عمان، بغداد اور مکہ معظّمہ میں عرب دوستوں کے سامنے اپنے ناقدانہ خیالات، اپنے مخلصانہ مشورے اور اپنے تأثرات وجذبات پیش کرنے کا بار بار اتفاق ہوا، اور انھوں نے ہمیشہ فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا''۔ (عالم عربی کا المیہ ص ۱۵۸)

سیاسی ہلچل پر مومنانہ اور مفکرانہ تبصرہ

۱۹۸۶ء میں مولانا کراچی پہنچے تو وہاں موجودہ حکومت کے خلاف عوام موشگافیاں کر رہے تھے اور بے نظیر کے پاکستان آنے پر اس کا ایسا استقبال ہو رہا تھا مولانا کے الفاظ میں ''جیسے آسمان سے کوئی نجات دہندہ فرشتہ نازل ہوا ہے'' اس صورت حال سے مولانا کی طبیعت پر اثر پڑا، لیکن پھر مولانا خاموش نہ رہ سکے اور ذاتی ملاقاتوں نہیں بلکہ مجمع میں احقاق حق کیا اور فرمایا:

''جس معاشرہ کا حال یہ ہو کہ کوئی سریلی صدا لگا دے، کوئی بازیگر آ کر سبز باغ دکھائے، کوئی شخص بھی قیادت کا جھنڈا بلند کر دے تو اس کا ایسا استقبال کیا جائے کہ جیسے دیر سے اس کا انتظار تھا، اور یہی ایک خلا تھا، جو پر نہیں ہوا تھا، وہ آواز لگائے تو یہ معلوم ہو کہ جیسے دل سینوں سے نکل پڑیں گے اور سارے حدود وقیود پیچھے رہ جائیں گے، سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اہلِ کوفہ کو مخاطب کر کے کہا تھا، انتم اتباع کل ناعق تم ہر آواز لگانے والے اور زور سے بولنے والے کے پیچھے لگ جاتے ہو'' پھر میں نے بتایا کہ قرآن شریف میں عہد موسوی کا ایک بڑا عبرت انگیز قصہ آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم قالوا یٰموسیٰ اجعل لنا الھا کما لھم اٰلھۃ قال انکم قوم تجھلون۔ ان ھؤلاء متبر ما ھم فیہ وبٰطل ما کانوا یعملون

ترجمہ: ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اتار دیا پھر وہ ایسے لوگوں پر گذرے جو اپنے بتوں کو لئے بیٹھے تھے (اس پر بنی اسرائیل) کہنے لگے! اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک دیوتا ایسا ہی بنا دیجئے جیسے ان کے (یہ) دیوتا ہیں (موسیٰ) نے کہا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ ہو کر رہے گا اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں ہے بھی (بالکل) باطل۔'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۷۳)

۱۹۸۶ء میں پاکستان کے حالات بے نظیر کی آمد، سیاسی گلیاروں میں ہلچل بیرونی دنیا کی سازش اور پاکستان میں اس کے والہانہ استقبال کو ذہن میں رکھتے ہوئے مولانا کی گفتگو کا یہ انداز اور یہ رخ بھی دیکھیے اور مومنانہ فراست وجرأت کو محسوس کیجئے:

''یہاں آپ کتنی دشواریوں، نگرانیوں، بدگمانیوں، خوردہ گیریوں اور کسی دوسرے فرقہ یا اکثریت کے منافرت ومخالفت سے محفوظ ہیں، حدیث میں نسوانی فطرت کی یہ کمزوری بیان کی گئی ہے، اس سے آپ کو دور رہنا چاہیے، حدیث میں کہا گیا ہے کہ عورت کی فطری کمزوری یہ ہے کہ عمر بھر شوہر اس پر احسان کرے پھر کسی وقت اس کی کسی خواہش یا فرمائش کی تعمیل میں تھوڑی سی کمی رہ جائے تو کہے کہ ہم نے تو اس گھر میں آ کر کبھی آرام کا منہ نہیں دیکھا، ہم نے اس گھر میں کبھی سکھ نہیں پایا، ھل من مزید کا نعرہ تو خیر ایک معنویت رکھتا ہے لیکن ھل من جدید کا نعرہ خطرناک ہے، جو بہت سے مسلم معاشروں اور آزاد مسلم حکومتوں کا شعار بن گیا ہے، پھر میں نے بتایا کہ کتنے مسلم وعرب ممالک میں اسلام اور دیندار، اسلامی قوانین کے نفاذ کے مطالبہ اور اسلامی تحریکوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے، آپ کا طریقۂ فکر اور طرز عمل حقیقت پسندانہ، ایجابی و تعمیری ہونا چاہیے، اپنے ملک کے حالات کا دوسرے ملکوں کے حالات سے تقابل کرنا چاہیے، پھر جو کچھ حاصل ہو، اس پر ثبات ودوام اور اس کی دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مزید توفیق عطا فرمائے، جلد ہر چیز کا جواب مایوسی اور محاذ آرائی سے نہیں دینا چاہیے، ذمہ دارانِ حکومت کے خلاف پہلے ہی لمحہ پر صف آرائی کے بجائے افہام وتفہیم سے کام لینا اور ان کو اس مسئلہ میں مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۷۶)

احقاق حق اور ابطال باطل

ایران میں خمینی انقلاب کے بعد مولانا نے جہاں نقد کیا اور ''دو متضاد تصویریں'' تصنیف کی اور ہندوستان جیسے ملک میں ملت کی متنوع ذمہ داریوں کا بوجھ کاندھوں پر ہونے کے باوجود جس طرح احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دیا وہ چشم کشا اور رہنما ہے، اسی سلسلہ کا ایک اقتباس پیش ہے:

''.....لیکن یہ دیکھ کر صدمہ بھی ہوا اور حیرت بھی کہ مسلمانوں کے ایک حلقہ میں ان سے ایسی

عقیدت ومحبت کا اظہار کیا جا رہا ہے، جو اس عصبیت کی حد تک پہنچ گئی ہے، جو تنقید کا ایک لفظ سننے کی روادار نہیں ہوتی، مدح وذم اور تاریخ وتنقید کا معیار کتاب وسنت، اسوۂ سلف اور عقائد ومسلک کی صحت نہیں، بلکہ اسلام کے نام مطلق حکومت کے قیام کا نعرہ، طاقت کا حصول، کسی مغربی طاقت کو للکار دینا، اور اس کے لئے (خواہ عارضی وظاہری طور پر) مشکلات پیدا کرنا، اس کو محبوب اور مثالی قائد بنا لینے کے لئے کافی ہے، آیت اللہ خمینی صاحب کی اس کامیابی سے (جس کی مدت عمر معلوم نہیں) اور اس انقلاب سے جو ایک مخصوص شکل میں ایران کے معاشرے میں رونما ہوا، ایرانی نوجوانوں کے جذبۂ قربانی اور اس کے ساتھ متعدد مسلم وعرب ممالک کی دینی واخلاقی کمزوریوں وخامیوں اور وہاں کی ناپسندیدہ صورت حال سے برصغیر کے مسلمان نوجوانوں کے اس حلقہ میں جو موجودہ حالات سے بےزار تھا، اور جو ہر اس حوصلہ مندی اور مہم جوئی سے مسحور ہوتا ہے جس میں اسلامی حکومت کا نام شامل ہو جائے، خمینی صاحب اس طرح بلکہ اس سے زیادہ مقبول ہو رہے ہیں، جیسے کسی زمانے میں کمال اتاترک اور عرب قوم پرستوں کے حلقہ میں جمال عبد الناصر تھے،.....

تاریخ کی شہادت اور انسانی نفسیات کا بار بار کا تجربہ ہے کہ جب بھی بڑے سے بڑے فسادِ عقیدہ، ضلالت اور کج روی کے ساتھ حوصلہ مندی، مہم جوئی اور تقشّف وجفاکشی کے مظاہر جمع ہو جاتے ہیں تو اس تحریک ودعوت میں ایسی دل کشی اور ساحری پیدا ہو جاتی ہے کہ اچھے اچھے عاقل وذکی، دین پسند اور صاحبِ مطالعہ ونظر اشخاص کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنا اور اس کی ثنا خوانی اور مداحی سے روکنا مشکل ہو جاتا ہے، قرنِ اول کے خوارج کی تحریک، چھٹی ساتویں صدی میں باطنیوں کی تحریک، اور حسن بن صباح اور قلعۃ الموت کے فدائیوں کے کارنامے اور خود ہندوستان کی بعض نیم عسکری تحریکوں اور تنظیموں کے بارہ میں حوصلہ مند نوجوانوں اور اقتدار وسیاسی طاقت کی شمع کے پروانوں کی والہانہ وخود فراموشانہ کیفیات (جن کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا) اس کی گواہ ہیں، اور یہی مرحلہ حق وہدایت کو معیار سمجھنے والوں اور عقیدۂ صحیحہ اور منصوصاتِ قرآنی کے بارہ میں حمیت وغیرت رکھنے والوں کے لئے امتحان کا موقعہ ہوتا ہے، اور ان کو اس اعلانِ حق کی دعوت دیتا ہے جو سحر انگریزی کی اس فضا میں "كلمة حق عند سلطان جائر" کا ثواب ومقام دلانے کا ضامن ہوتی ہے" (کاروان زندگی ج ۳ ص ۲۵۵۔۲۵۶)

تفاخر بالاسلاف میں غلو درست نہیں

یہ گفتگو تو پاکستان میں ہوئی لیکن جو ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے وہ بہر حال صفائی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور پوری جرأت وصراحت کے ساتھ ان نقائص کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو آج کل تقریباً ہر ملک کے علماء کی اکثریت میں عام ہو گئے ہیں، جس کے سبب حالات کی تبدیلی ایک خواب معلوم ہوتی ہے، جہاں اور نقائص نہیں وہاں اسلاف کے

نام پر بہر حال روایت پرستی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ سیرت کی روشنی میں کوئی مکمل اسلامی نظام نظر نہیں آتا، جو کچھ اسلامیت نظر آتی ہے، اس کو سیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بس پیوند کاری ہی کہا جا سکتا ہے:

''ان میں سے ایک اعتقادی اور سیاسی انتشار ہے، دوسرا علماء کے عوام کے ساتھ رابطہ کی کمی، تیسرا علماء میں عام طور پر ہمارے اسلاف کی طرح زہد کا رجحان، اس توکل اور استغناء اور زندگی کی سادگی اور ایثار کی کمی ہے جس میں اسی ملک کی تخصیص نہیں، دوسرے اسلامی ممالک بھی شامل ہیں، اس سلسلہ میں قریبی اسلافِ کرام کی کچھ مثالیں بھی دی گئیں۔

چوتھا تہذیبی و لسانی تعصب اس ملک کے لئے سخت خطرناک ہے، اور ہمارے علماء کو اس کو ختم کرنے کے لئے پوری جد و جہد کرنی چاہیے، پھر میں نے تفاخر بالانساب کی طرح تفاخر بالاسلاف میں غلو و مبالغہ پر تنقید کی، اور کہا کہ ہر وقت اسی کی رٹ لگائے جانا، اور ہر وقت اسی کا وظیفہ پڑھنا کچھ مفید نہیں کہ ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اسلاف ایسے تھے، کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی، تحریک سے چلتی ہے۔''
(کاروان زندگی ج ۳ ص ۷۳)

مدارس اسلامیہ کا نصب العین

مدارس کا نصب العین تحریک ہونا چاہیے نہ کہ تاریخ کا بیان اور اس پر فخر اور آج کے دور میں جمود بلکہ تعطل پر بھی صبر و رضا بتانے والے بتاتے ہیں کہ اب تو بعض ارباب مدارس اس پر بھی راضی ہیں کہ اگر ایک آدھ افراد بھی پیدا ہو جائیں تو کافی ہے کہ اسی سے مدرسے کے وجود کو کار آمد سمجھنا چاہیے، مولانا اس روش کے خلاف تھے مدرسی نظام کی مروجہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا کے یہ الفاظ پڑھیے:

''میں نے صفائی سے کہا کہ مدرسے اور دینی دعوتیں تاریخ سے نہیں چلتیں، تحریک سے چلتی ہیں۔ ہر وقت اسلاف و اکابر کا نام لینا اور ان پر فخر کرنا اور ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ لگانا، سننے والوں کو بھی ملول و متوحش کر دیتا ہے'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۷۷)

صرف نصابی کتابیں سمجھنا کافی نہیں

مدارس کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ایک آدھ طلبہ کے بامقصد ہونے پر قناعت کر لی گئی ہے، تبلیغی و دعوتی اور تصنیفی و تحقیقی میدان میں پستی کے ساتھ تحریکی اور قائدانہ کردار میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ مخفی نہیں، ضرورت ہے کہ کام اور پیغام کو یاد رکھا جائے اور تجزیہ کرتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل تیار کیا جائے:

''مدارس دینیہ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ نصابی کتابیں سمجھ لی جائیں اور مسئلے مسائل بتا دئے جائیں، ہم ان کی ناقدری نہیں کرتے، اس نظام تعلیم کا ہم احترام کرتے ہیں، اور اس کے داعی اور ذمہ دار ہیں، لیکن صرف اتنا کافی نہیں، موجودہ فتنوں کو سمجھنا ان سے اچھی طرح باخبر ہونا اور ان کا مؤثر و طاقت ور زبان اور

دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضہ ہے، ہمارے طلبہ واساتذہ انگریزی اور کسی غیر ملکی زبان سے بھی واقف ہوں اوران کے مآخذ سے فائدہ اٹھاسکیں اورایسالٹریچر تیار کریں جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کومتاثر کر سکے، ہمارے اساتذہ وطلباء کا مطالعہ وسیع ،متنوع اور اپٹوڈیٹ ہو، ندوۃ العلماء نے عرب قوم پرستی اور علمانیت (سیکولرازم) کے خلاف جوز بردست محاذ قائم کیا تھااوراس کے فرزندوں نے جس طرح پوری تیاری اورقوت کے ساتھ طاقتوراور مؤثر اسلوب میں اس فتنہ پرضرب کاری لگائی تھی، اس کا عام طور پر عالم عربی میں اعتراف کیا گیا''۔ (کاروان زندگی ج۶ص ۲۶۵)

معیار مدح وذم

جس وقت حضرت مولاناؒ کومعیار مدح وذم نے چونکایا تب تک حالت یہاں تک نہ پہونچی تھی جوآج کی منظر نامہ پرظاہر ہے، اب تو مذہبی حلقوں میں بھی وہی معیار تعریف وتنقید ہے جو کبھی مادی وسیاسی حلقہ میں ہوا کرتا تھا، محض شخصیت پرستی، خاندان پرستی، اقرباپروری اور مادی معیاری مدح وذم کا معیار بن چکا ہے، اسلام کی منفعت اوراسلام کا نقصان ملی نقصان اور ملی مفاد کس کے پیش نظر؟ بس ہم اور ہماری بات اور ہمارے فائدہ کا زمانہ ہے، جس کوایک ادنی حس رکھنے والا بھی محسوس کررہا ہے، جس کے باعث نقصانات میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے اورلوگ اب توصحیح وغلط کی تمیز بھی اس معیار کے سبب نہیں کرپارہے ہیں، مولانا نے یہ اہم سطریں ایک انتہائی حساس مسئلہ میں ملت کے قائدین کے کردار کو پیش نظر رکھ کر لکھیں:۔

''مصنف کے دردمند دل کو دیکھ کر اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ بہت سے خالص دینی حلقوں میں بھی مدح و ذم اور تعریف وتنقید کا معیار کسی شخص کی اسلامیت اور غیر اسلامیت اوراسلام ومسلمانوں کا سود وزیاں نہیں رہا، بلکہ خالص دنیاوی کارنامے، مادی فتوحات (اورافسوس وحیرت ہے کہ یہاں اس کا بھی وجود نہیں) سیاسی پروپیگنڈہ، اخبار نویسیوں اوراہل سیاست کا خراج تحسین، ماتمی جلوس اور جنازہ کی دھوم دھام اوراس طرح کی سطحی اور ظاہری شکلیں رہ گئی ہیں، اس سے مصنف کو یہ انکشاف آمیز احساس ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں جواس طبقہ کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھا تیزی کے ساتھ انحطاط آرہا ہے، اور یہ وہ نقصان ہے، جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں، یہی احساسات ومشاہدات ہیں جنھوں نے ان مضامین وتقاریر کوایک مجموعے میں شائع کرنے کی تحریک کی جن کے متعلق خود مصنف کو احساس ہے کہ اس کا اس وقت شائع ہونا بہت سی طبیعتوں پر گراں گذرے گا، لیکن مصنف اس کی ضرورت سمجھتا ہے، اوراس کو دین کی ایک اہم خدمت اوراپنی سعادت یقین کرتا ہے۔

نوارا تلخ ترمی زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چوں محمل را گراں بینی''

(عالم عربی کا المیہ ص ۲۳۔۲۴)

مدارس اور احساس کمتری

مولاناؒ نے ۱۹۵۴ء میں تقریر کرتے ہوئے مدارس کی افسردہ فضا کا شکوہ کیا ہے، اور پوری جرأت کے ساتھ انحطاط کا شکوہ کیا ہے، ان سے بھی پہلے اقبال یہ شکوہ کر چکے ہیں، مولاناؒ نے بھی اس پر حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے، لیکن افسوس اس پر ہے کہ آج صورت حال اور زیادہ خطرناک ہو چکی ہے، شاید ہم ان نقائص کا پتہ لگانے کے لئے تیار نہیں جو اس احساس کہتری کا باعث ہیں جس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے مولاناؒ نے کیا ہے، یا اگر نقائص معلوم ہیں تو ان کی پرواہ نہیں یا پھر ان کو دور کرنے کی جرأت نہیں، بہر حال اس پر غور کرنے اور اس کے ازالہ کی از حد ضرورت ہے تا کہ کسی حد تک صحیح لیکن کچھ تو اس افسردہ فضا میں زندگی کی رمق پیدا ہو اور یہ اپنی افادیت ثابت کر سکیں اور پھر سے دنیا کی امامت کا فریضہ انجام دے سکیں، زندگی کے ہر شعبہ میں زمانہ کی پیروی کے بجائے زمانہ ان کا غلام ہو:۔

''مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے، اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں، وہ مایوسی، افسردگی، اور احساس کہتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں، درس کی کتابوں کی تعداد میں، کتب خانے کے مندرجات کی تعداد میں، وظائف کی تعداد میں، بہت بڑا اضافہ ہے، مگر زندگی کی نبض سست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس دردمند کبھی کبھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور وہ اس بحر کا ہل کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دعا کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے، آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں، جو مدارس کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں، یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے، جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلۂ صوت کا ہے''۔ (پاجا سراغ زندگی ص۔۹۶، ۹۷)

ایک تاریخی حقیقت

آج اکثر تحریکوں اور اداروں میں جمود پایا جاتا ہے، بے شمار ٹھوس بنیادوں پر اٹھنے والی تحریکیں اور قائم ہونے والے ادارے ایسا لگتا ہے کہ کام کرتے کرتے تھک چکے ہیں، اور اب صرف عظمت رفتہ اور ایام گزشتہ کی تاریخ کے سنہرے ابواب پر فخر کرنا ہی ان کا مقدر بن گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس رویہ سے تحریک و اداروں کا باقی رہنا مشکل ہے، حضرت

مولاناؒ نے اس رویہ پر سخت تنقید کرتے ہوئے صریح الفاظ میں قرآن کی روشنی میں فرمایا تھا:

''دنیا میں کوئی ادارہ محض اس وجہ سے نہیں چل سکتا کہ یہ ادارہ آج سے سو برس دو سو برس پہلے قائم ہوا، اور اس نے کچھ مفید خدمت انجام دی تھی، محض تاریخ کے بل پر، محض تاریخ کے سہارے کوئی ادارہ، کوئی تحریک، کوئی فلسفہ، کوئی نظام نہ چلا ہے نہ چلے گا، اگر آپ کسی ادارے کو قائم رکھنے کے لئے اور اس کے لئے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ پیش کرتے ہیں کہ اس نے دور ماضی میں یہ خدمات انجام دیں، تو لوگ اس کو بالکل نہیں سنیں گے، اور اگر کوئی آج خاموش ہو جائے گا، تو کل اس کے اندر سے نہایت پرزور اور پرجوش تقاضا پیدا ہوگا کہ اس کو ختم کر دینا چاہئے''۔ (پاجا سراغ زندگی۔ص، ۱۵۹)

بقاء کے لیے افادیت کا ثبوت لازمی ہے

آج برصغیر میں دن بدن مدارس کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر ہی نہیں اپنے بھی اور مخلصین بھی مدارس کے قیام اور ان کے کام پر سوال کھڑے کر رہے ہیں، کہیں نہ کہیں نقص ضرور ہے، اور سچ یہ ہے کہ مدارس کی جو نافعیت وافادیت نظر آنی چاہئے وہ نہیں نظر آتی، جس کے سبب لوگوں کو اس کا موقع مل رہا ہے کہ وہ مدارس کے قیام وکام پر سوالیہ نشان لگائیں۔

وہ مقتضیات زمانہ سے ناواقف، ضروریات زمانہ کو پورا کرنے سے قاصر اور اپنے مقاصد سے دور ہوتے جا رہے ہیں، قانون قدرت میں بھی زندگی کا استحقاق صرف نفع پہونچانے والوں کو ہی ہے، مولاناؒ نے بڑی جرأت وصراحت کے ساتھ فرمایا:۔

''اگر ہمارے مدارس یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی رہیں، اور وہ اس زندگی میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں، زندگی کا استحقاق ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے اندر نافعیت پیدا کرنی چاہئے، یعنی ان کو اپنے جوہر کا ثبوت دینا چاہئے، ان کو یہ ثابت کرنا چاہئے کہ زندگی کی کوئی ضرورت ہے جو ان کے بغیر پوری نہیں ہوتی''۔ (پاجا سراغ زندگی۔ص، ۱۶۱)